# آٹھویں امام حضرت علی رضا علیہ السلام

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

## نام و نسب

علیؑ نام رضا لقب اور ابوالحسن کنیت۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام والد بزرگوار تھے اور اس لئے آپ کو پورے نام و لقب کے ساتھ یاد کیا جائے تو امام ابوالحسن علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کہا جائے گا۔ والدہ گرامی کی کنیت ام البنین اور لقب طاہرہ تھا نہایت عبادت گزار بی بی تھیں۔

## ولادت

۱۱رذیقعدہ ۱۴۸ھ میں مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی اس کے تقریباً ایک ماہ قبل ۱۵رشوال کو آپ کے جد بزرگوار امام جعفر صادقؑ کی وفات ہوچکی تھی۔ اتنے عظیم حادثہ مصیبت کے بعد جلد ہی اس مقدس مولود کے دنیا میں آجانے سے یقیناً تمام گھرانے میں ایک سکون اور تسلی محسوس کی گئی۔

## تربیت

آپ کی نشو نما اور تربیت اپنے والد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے زیر سایہ ہوئی۔ اور اسی مقدس ماحول میں بچپنا اور جوانی کی متعدد منزلیں طے ہوئیں۔ اور پینتیس برس کی عمر پوری ہوئی۔ اگرچہ آخری چند سال اس مدت کے وہ تھے جب امام موسیٰؑ کاظم عراق میں قید و ظلم کی سختیاں برداشت کررہے تھے مگر اس سے پہلے ۲۸ یا ۲۹ برس آپ کو برابر اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

## جانشینی

امام موسیٰ کاظمؑ کو معلوم تھا کہ حکومت وقت آپ کو آزادی سے سانس نہ لینے دیگی۔ اور ایسے حالات پیش آجائیں گے کہ آپ کے آخری عمر کے حصے میں اور دنیا کو چھوڑنے کے موقع پر دوستان اہلبیتؑ کا آپ سے ملنا یا بعد کے رہنما کا دریافت کرنا غیر ممکن ہوجائے گا۔ اس لئے آپ نے انھیں آزادی کے دنوں اور سکون کے اوقات میں جب کہ آپ مدینہ میں تھے پیروان اہلبیتؑ کو اپنے بعد ہونے والے امام سے روشناس بنانے کی ضرورت محسوس فرمائی۔ چنانچہ اولاد علیؑ و فاطمہؑ میں سے سترہ آدمی جو ممتاز حیثیت رکھتے تھے جمع فرما کر اپنے فرزند حضرت علی رضاؑ کی وصایت اور جانشینی کا اعلان فرمادیا اور ایک وصیت نامہ تحریراً بھی مکمل فرمایا جس پر مدینہ کے معززین میں سے ساٹھ آدمیوں کی گواہی لکھی گئی۔ یہ اہتمام دوسرے ائمہؑ کے یہاں نظر نہیں آتا۔ صرف ان خصوصی حالات کی بناء پر جن سے دوسرے ائمہؑ اپنی وفات کے موقع پر دوچار نہیں ہونے والے تھے۔

## دور امامت

حضرت امام رضاؑ کی پینتیس برس کی عمر تھی جب آپ

کے والد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی وفات ہوئی اور امامت کی ذمہ داریاں آپ کی طرف منتقل ہوئیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب بغداد میں ہارون الرشید تخت خلافت پر تھا اور بنی فاطمہ کے لئے حالات بہت ناسازگار تھے۔ اس ناخوش گوار ماحول میں حضرت نے خاموشی کے ساتھ شریعت حقہؑ کے خدمات انجام دینا شروع کر دیئے۔

## علمی کمال

آل محمدؐ کے اس سلسلے میں ہر فرد حضرت احدیت کی طرف سے بلند ترین علم کے درجہ پر قرار دی گئی تھی جسے دوست اور دشمن سب کو ماننا پڑتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کو علمی فیوض پھیلانے کا زمانہ نے کم موقع دیا اور کسی کو زیادہ چنانچہ ان حضرات میں سے امام جعفر صادقؑ کے بعد اگر کسی کو سب سے زیادہ موقع حاصل ہوا ہے تو وہ امام رضا علیہ السلام ہیں۔ جب آپ امامت کے منصب پر نہیں پہنچے تھے اس وقت حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اپنے تمام فرزندوں اور خاندان کے لوگوں کو نصیحت فرماتے تھے کہ تمہارے بھائی علی رضاؑ عالم آل محمدؐ ہیں۔ اپنے دینی مسائل کو ان سے دریافت کر لیا کرو اور جو کچھ وہ کہیں اسے یاد رکھو اور پھر حضرت موسیٰ کاظمؑ کی وفات کے بعد جب آپ مدینہ میں تھے اور روضۂ رسولؐ پر تشریف فرما رہتے تھے تو علماء اسلام مشکل مسائل میں آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ محمد ابن عیسیٰ یقطینی کا بیان ہے کہ میں نے ان تحریری مسائل کو جو حضرت امام رضاؑ سے پوچھے گئے تھے اور آپ نے ان کا جواب تحریر فرمایا تھا اکٹھا کیا تو اٹھارہ ہزار کی تعداد میں تھے۔

## زندگی کے مختلف دور

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے بعد دس برس ہارون کا دور رہا۔ یقینا وہ امام رضاؑ کے وجود کو بھی دنیا میں اسی طرح پر برداشت نہیں کر سکتا تھا جس طرح اس کے پہلے آپ کے والد بزرگوار کا رہنا اس نے گوارہ نہیں کیا۔ مگر یا تو امام موسیٰ کاظمؑ کے ساتھ جو طویل مدت تک تشدد اور ظلم ہوتا رہا اور جس کے نتیجہ میں قید خانہ ہی کے اندر آپ دنیا سے رخصت ہو گئے اس سے حکومت وقت کی عام بدنامی ہو گئی تھی اور یا واقعی ظالم کو خود اپنی بدسلوکیوں کا احساس اور ضمیر کی طرف سے ملامت کی کیفیت تھی جس کی وجہ سے کھلم کھلا امام رضاؑ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ ایک دن یحیٰی ابن خالد برمکی نے اپنے اثر اور رسوخ کے بڑھانے کے لئے یہ کہا بھی کہ علیؑ ابن موسیٰؑ بھی اب اپنے باپ کے بعد امامت کے اسی طرح دعوے دار ہیں۔ تو ہارون نے جواب دیا کہ جو کچھ ہم نے ان کے باپ کے ساتھ کیا وہی کیا کم ہے جواب تم چاہتے ہو کہ میں اس نسل ہی کا خاتمہ کر دوں۔

پھر بھی ہارون رشید کا اہلبیت رسولؐ سے شدید اختلاف اور سادات کے ساتھ جو برتاؤ اب تک رہا تھا اس کی بنا پر عام طور سے عمّال حکومت یا عام افراد بھی جنھیں حکومت کو راضی رکھنے کی خواہش تھی اہلبیتؑ کے ساتھ کوئی اچھا رویہ رکھنے پر تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ اور نہ امام کے پاس آزادی کے ساتھ لوگ استفادہ کے لئے آسکتے تھے۔ نہ حضرت کو سچے اسلامی احکام کی اشاعت کے مواقع حاصل تھے۔

ہارون کا آخری زمانہ اپنے دونوں بیٹوں امین اور مامون کی باہمی رقابتوں سے بہت بے لطفی میں گذرا۔ امین پہلی بیوی سے تھا جو خاندان شاہی سے منصور دوانیقی کی پوتی تھی۔ اور اس لئے عرب سردار سب اس کے طرفدار تھے۔ اور مامون ایک عجمی کنیز کے پیٹ سے تھا۔ اس لئے دربار کا عجمی طبقہ اس سے محبت رکھتا تھا۔ دونوں کی آپس میں رسہ کشی ہارون کے لئے سوہان روح بنی رہتی تھی۔ اس نے اپنے خیال میں اس کا تصفیہ مملکت کی تقسیم کے ساتھ یوں کردیا کہ دارالسلطنت بغداد اور اس کے چاروں طرف کے عربی حصے جیسے شام، مصر، حجاز، یمن وغیرہ محمد امین کے نام کئے گئے اور مشرقی ممالک جیسے ایران، خراسان، ترکستان وغیرہ مامون کے لئے مقرر کئے گئے۔ مگر یہ تصفیہ تو اس وقت کارگر ہوسکتا تھا جب دونوں فریق ''جیو اور جینے دو'' کے اصول پر عمل کرتے ہوتے۔

لیکن جہاں اقتدار کی ہوس کارفرما ہو وہاں اگر بنی عباس کے ہاتھوں بنی فاطمہ کے خلاف ہر طرح کے ظلم وتعدی کی گنجائش پیدا ہوسکتی ہے تو خود بنی عباس میں ایک گھر کے اندر دو بھائی اگر ایک دوسرے کے مدمقابل ہوں تو کیوں نہ ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ کارروائیاں کرنے پر تیار نظر آئے۔ اور کیوں نہ ان طاقتوں میں باہم تصادم ہو جب کہ ان میں سے کوئی اس ہمدردی اور ایثار اور خلق خدا کی خیرخواہی کا بھی حامل نہیں ہے۔ جسے بنی فاطمہ اپنے پیش نظر رکھ کر اپنے واقعی حقوق سے چشم پوشی کرلیا کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ادھر ہارون کی آنکھ بند ہوگئی اور ادھر بھائیوں میں خانہ جنگی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ آخر چار برس کی مسلسل کشمکش اور طویل خوں ریزی کے بعد مامون کو کامیابی ہوئی اور اس کا بھائی امین محرم ۱۹۸ھ میں تلوار کے گھاٹ اُتار دیا گیا اور مامون کی خلافت تمام بنی عباس کے حدود سلطنت پر قائم ہوگئی۔

## ولی عہدی

امین کے قتل ہونے کے بعد سلطنت تو مامون کے پائے نام ہوگئی۔ مگر یہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ امین ننھیال کی طرف سے عربی النسل تھا اور مامون عجمی النسل۔ امین کے قتل ہونے سے عراق کی عرب قوم اور ارکان سلطنت کے دل مامون کی طرف سے صاف نہیں ہوسکتے تھے۔ بلکہ ایک غم وغصہ کی کیفیت محسوس کرتے تھے۔ دوسری طرف خود بنی عباس میں سے ایک بڑی جماعت جو امین کی طرفدار تھی اس سے بھی مامون کو ہر وقت خطرہ لگا ہوا تھا اولاد فاطمہ میں سے بہت سے لوگ جو وقتاً فوقتاً بنی عباس کے مقابل میں کھڑے ہوتے رہے تھے وہ خواہ قتل کردیئے گئے ہوں یا جلا وطن کئے گئے ہوں یا قید رکھے گئے ہوں۔ ان کے بھی موافق ایک جماعت تھی جو اگر حکومت کا کچھ بگاڑ نہ بھی سکتی تب بھی دل ہی دل میں حکومت بنی عباس سے بیزار ضرور تھی۔

ایران میں ابومسلم خراسانی نے بنی امیہ کے خلاف جو اشتعال پیدا کیا تھا وہ ان مظالم ہی کو یاد دلاکر جو بنی امیہ کے ہاتھوں حضرت امام حسینؑ اور دوسرے بنی فاطمہ کے ساتھ ہوئے تھے اس سے ایران میں اس خاندان کے ساتھ ہمدردی کا پیدا ہونا فطری تھا۔ درمیان میں بنی عباس نے اس

سے غلط فائدہ اٹھایا۔ مگر اتنی مدت میں کچھ نہ کچھ تو ایرانیوں کی آنکھیں بھی کھلی ہی ہوں گی کہ ہم سے کہا گیا تھا اور اقتدار کن لوگوں نے حاصل کرلیا۔ ممکن ہے کہ ایرانی قوم کے ان رجحانات کا چرچہ مامون کے کانوں تک بھی پہنچا ہو۔ اب جس وقت کہ امین کے قتل کے بعد وہ عرب قوم پر اور بنی عباس کے خاندان پر بھروسہ نہیں کرسکتا تھا اور اسے ہر وقت اس حلقہ سے بغاوت کا اندیشہ تھا۔ تو اسے سیاسی مصلحت اسی میں معلوم ہوئی کہ عرب کے خلاف عجم اور بنی عباس کے خلاف بنی فاطمہ کو اپنا بنایا جائے اور چونکہ طرز عمل میں خلوص سمجھا نہیں جاسکتا اور وہ عالم طبائع پر اثر نہیں ڈال سکتا اگر یہ نمایاں ہوجائے کہ وہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہے۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ مامون مذہبی حیثیت سے اپنی شیعیت اور ولائے اہلبیتؑ کے چرچے عوام کے حلقوں میں پھیلائے اور یہ دکھلائے کہ وہ انتہائی نیک نیتی سے اب ''حق بحق دار رسید'' کے مقولہ کو سچا بنانا چاہتا ہے۔

اس سلسلہ میں جیسا کہ جناب شیخ صدوق اعلیٰ اللہ مقامہ نے تحریر فرمایا ہے اس نے اپنی نذر کی حکایت کی بھی تشہیر کی کہ جب امین کا اور میرا مقابلہ تھا اور بہت نازک حالت تھی اور عین اسی وقت میرے خلاف سیستان اور کرمان میں بھی بغاوت ہوگئی تھی اور خراسان میں بھی بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور میری مالی حالت بھی ابتر تھی اور فوج کی طرف سے بھی اطمینان نہ تھا تو اس سخت اور دشوار ماحول میں میں نے خدا سے التجا کی اور منت مانی کہ اگر یہ سب جھگڑے ختم ہوجائیں اور میں خلافت تک پہنچوں تو اس کو اس کے اصلی حقدار یعنی اولاد فاطمہ میں سے جو اس کا اہل ہے اس تک پہنچا دوں گا۔ اسی نذر کے بعد سے میرے سب کام بننے لگے اور آخر تمام دشمنوں پر مجھے فتح حاصل ہوئی۔

یقینا یہ واقعہ مامون کی طرف سے اس لئے بیان کیا گیا کہ اس کا طرز عمل خلوص قلب اور حسن نیت پر مبنی سمجھا جائے۔ یوں تو اہلبیتؑ کے جو کھلے ہوئے سخت سے سخت دشمن تھے۔ وہ بھی ان کی حقیقت اور فضیلت سے واقف تھے ہی اور ان کی عظمت کو جانتے تھے مگر شیعیت کے معنی صرف یہ جاننا تو نہیں ہیں۔ بلکہ محبت رکھنا اور اطاعت کرنا ہیں اور مامون کے طرز عمل سے یہ ظاہر ہے کہ وہ اس دعویٰ شیعیت اور محبت اہلبیت کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود امام کی اطاعت نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ امام کو اپنے منشاء کے مطابق چلانے کی کوشش تھی۔ ولی عہد بننے کے بارے میں آپ کے اختیارات کو بالکل سلب کردیا گیا اور آپ کو مجبور بنادیا گیا تھا اس سے ظاہر ہے کہ یہ ولی عہدی کی تفویض بھی ایک حاکمانہ تشدد تھا جو اس وقت شیعیت کے بھیس میں امام کے ساتھ کیا جارہا تھا۔

امام علیہ السلام کا اس ولی عہدی کو قبول کرنا، بالکل ایسا ہی تھا جیسا ہارون کے حکم سے امام موسیٰ کاظمؑ کا جیل خانہ چلا جانا۔ اسی لئے جب امام رضاؑ مدینہ منورہ سے خراسان کی طرف روانہ ہورہے تھے تو آپ کے رنج، صدمہ اور اضطراب کی کوئی حد نہ تھی روضۂ رسولؐ سے رخصت کے وقت آپ کا وہی عالم تھا جو حضرت امام حسینؑ کا مدینہ سے روانگی کے موقع پر تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ بیتابانہ

روضہ کے اندر جاتے ہیں اور نالۂ وآہ کے ساتھ اُمت کی شکایت کرتے ہیں پھر باہر نکل کر گھر جانے کا ارادہ کرتے ہیں اور پھر دل نہیں مانتا پھر روضہ سے جا کر لپٹ جاتے ہیں یہی صورت کئی مرتبہ ہوئی۔ راوی کا بیان ہے کہ میں حضرت کے قریب گیا تو فرمایا اے محول (حالات کو بدل دینے والے) میں اپنے جدامجد کے روضہ سے بہ جبر جدا کیا جارہا ہوں اب مجھ کو یہاں واپس آنا نصیب نہ ہوگا۔

۲۰۰ھ میں حضرت مدینہ منورہ سے خراسان کی جانب روانہ ہوئے اہل وعیال اور متعلقین سب کو مدینہ ہی میں چھوڑ گئے اس وقت امام محمد تقی علیہ السلام کی عمر پانچ برس کی تھی آپ بھی مدینہ ہی میں رہے جب حضرت مرو پہنچے جو اس وقت دارالسلطنت تھا تو مامون نے چند روز ضیافت وتکریم کے مراسم ادا کرنے کے بعد قبول خلافت کا سوال پیش کیا، حضرت نے اس سے اسی طرح انکار کیا جس طرح امیرالمومنینؑ چوتھے موقع پر خلافت پیش کئے جانے کے وقت انکار فرما رہے تھے مامون کو خلافت سے دست بردار ہونا درحقیقت منظور نہ تھا ورنہ وہ امام کو اسی پر مجبور کرتا چنانچہ جب حضرتؑ نے خلافت کے قبول کرنے سے انکار فرمایا تو اس نے ولی عہدی کا سوال پیش کیا۔ حضرتؑ اس کے بھی انجام سے واقف تھے۔ نیز بخوشی جابر حکومت کی طرف سے کوئی منصب قبول کرنا آپ کے مذہبی اصول کے خلاف تھا۔ حضرت نے اس سے بھی انکار فرمایا۔ مگر اس پر مامون کا اصرار جبر کی حد تک پہنچ گیا اور اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ اس کو منظور نہیں کر سکتے تو آپ کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

جان کا خطرہ قبول کیا جا سکتا ہے جب مذہبی مفاد کا قیام جان دینے پر موقوف ہو ورنہ حفاظت جان شریعت اسلام کا بنیادی حکم ہے۔ امام نے فرمایا: یہ ہے تو میں مجبوراً قبول کرتا ہوں، مگر کاروبار سلطنت میں بالکل دخل نہ دوں گا۔ ہاں اگر کسی بات میں مجھ سے مشورہ لیا جائے گا تو نیک مشورہ ضرور دوں گا، اس کے بعد یہ ولی عہدی صرف برائے نام سلطنتِ وقت کے ایک ڈھکوسلے سے زیادہ کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ جس سے ممکن ہے کچھ عرصہ تک کسی سیاسی مقصد میں کامیابی حاصل کرلی گئی ہو۔ مگر امام کی حیثیت اپنے فرائض کے انجام دینے میں بالکل وہ تھی جو ان کے پیش رَو حضرت علیؑ مرتضیٰ اپنے زمانہ کی باقتدار طاقتوں کے ساتھ اختیار کر چکے تھے۔ جس طرح ان کا کبھی کبھی مشورہ دے دینا ان حکومتوں کو صحیح وجائز نہیں بنا سکتا تھا ویسے ہی امام رضاؑ کا اس نوعیت سے ولی عہدی کا قبول فرمانا اس سلطنت کے جواز کا باعث نہیں ہوسکتا تھا۔ صرف مامون کی ایک راج ہٹ تھی جو اس طرح پوری ہوگئی۔ مگر امام نے اپنے دامن کو سلطنت ظلم کے اقدامات اور نظم ونسق سے بالکل الگ رکھا۔

بنی عباس مامون کے اس فیصلے سے قطعاً متفق نہ تھے۔ انھوں نے بہت کچھ درانداز یاں کیں، مگر مامون نے صاف کہہ دیا کہ علی رضاؑ سے بہتر کوئی دوسرا شخص تم بتا دو۔ اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس سلسلہ میں بڑے بڑے مناظرے بھی ہوئے۔ مگر ظاہر ہے کہ امام کے مقابلے میں کس کی علمی فوقیت ثابت ہوسکتی تھی۔ مامون کا فیصلہ اٹل تھا اور وہ اس

سے ہٹنے کے لئے تیار نہ تھا۔ نہ کوئی دوسرا دلائل سے اُسے قائل کرسکتا تھا کہ وہ اپنے فیصلہ کو بدل دیتا۔

یکم ماہ رمضان ۲۰۱ھ روز پنجشنبہ جلسۂ ولی عہدی منعقد ہوا۔ بڑی شان وشوکت اور تزک واحتشام کے ساتھ یہ تقریب عمل میں لائی گئی۔ سب سے پہلے مامون نے اپنے بیٹے عباس کو اشارہ کیا اور اس نے بیعت کی پھر اور لوگ بیعت سے شرف یاب ہوئے۔ سونے اور چاندی کے سکے سرمبارک پر نثار کئے گئے اور تمام ارکان سلطنت وملازمین کو انعامات تقسیم ہوئے۔ مامون نے حکم دیا کہ حضرت کے نام کا سکہ تیار کیا جائے۔ چنانچہ درہم ودینار پر حضرت کے نام کا نقش ہوا اور تمام قلمرو میں وہ سکہ چلایا گیا جمعہ کے خطبہ میں حضرت کا نام داخل کیا گیا۔

## اخلاق واوصاف

مجبوری اور بے بسی کا نام قناعت یا درویشی ''عصمت بی بی از بے چادری'' کے مقولہ کے موافق اکثر ابنائے دنیا کا شعار رہتا ہے مگر ثروت واقتدار کے ساتھ فقیرانہ زندگی اختیار کرنا بلند مرتبہ مردان خدا کا حصہ ہے۔ اہلبیت معصومینؑ میں سے جو بزرگوار ظاہری حیثیت سے اقتدار کے درجہ پر نہ تھے اور اکثر یہ حضرات ایسے ہی تھے وہ عموماً اچھے لباس اور شان کے ساتھ رہتے تھے۔ کیونکہ ان کی فقیری کو دشمن بے بسی پر محمول کرکے طعن وتشنیع پر آمادہ ہوتے اور حقانیت کے وقار کو ٹھیس لگتی مگر جو بزرگ اتفاقاتِ روزگار سے ظاہری اقتدار کے درجہ پر پہنچ گئے۔ انھوں نے اتنا ہی فقر اور سادگی کے مظاہرہ میں اضافہ کردیا تاکہ ان کی زندگی غریب مسلمانوں کی تسلی کا ذریعہ بنے اور ان کے لئے نمونہ عمل ہو۔ جیسے امیر المومنین حضرت علیؑ مرتضیٰ، چونکہ شہنشاہ اسلام مانے جارہے تھے اس لئے آپ کا لباس اور طعام ویسا زاہدانہ تھا جس کی مثال دوسرے معصومینؑ کے یہاں نہیں ملتی۔ یہی صورت حضرت علی رضاؑ کی تھی۔ آپ مسلمانوں کی اس عظیم الشان سلطنت کے ولی عہد بنائے گئے تھے جس کے وسعت مملکت کے سامنے روم وفارس کا ذکر بھی طاقِ نسیاں کی نذر ہوگیا تھا۔ جہاں اگر بادل سامنے سے گزرتا تو خلیفہ کی زبان سے آواز بلند ہوتی تھی کہ ''جا جہاں تجھے برسنا ہو برس، بہرحال تیری پیداوار کا خراج میرے ہی پاس آئے گا۔''

حضرت امام رضاؑ کا اس سلطنت ولی عہدی پر فائز ہونا دنیا کے سامنے ایک نمونہ تھا کہ دین والے اگر دنیا کو پاجائیں تو ان کا رویہ کیا ہوگا۔ یہاں امام رضاؑ کو اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ضرورت تھی کہ زہد اور ترک دنیا کے مظاہرے اتنے ہی نمایاں تر بنادیں۔ جتنے تزک واحتشام کے دنیاوی تقاضے زیادہ ہیں۔ چنانچہ تاریخ نے اپنے کو دہرا دیا اور علی رضاؑ کے لباس میں علیؑ مرتضیٰ کی سیرت دنیا کی نگاہوں کے سامنے آگئی۔ آپ نے اپنی دولت سرا میں قیمتی قالین بچھوانا پسند نہیں کئے بلکہ جاڑے میں بالوں کا کمّل اور گرمی میں چٹائی کا فرش ہوا کرتا تھا۔ کھانا سامنے لایا جاتا تو دربان، سائیس اور تمام غلاموں کو بلا کر اپنے ساتھ کھانے میں شریک فرماتے تھے۔ داب وآداب شاہی کے خوگر ایک بلخی شخص نے ایک دن کہہ دیا کہ حضور اگر ان لوگوں کے کھانے کا انتظام الگ ہوجایا کرے تو کیا حرج ہے۔ حضرت

نے فرمایا ''خالق سب کا اللہ ہے۔ ماں سب کی حوّا اور باپ سب کے آدمؑ ہیں۔ جزا و سزا ہر ایک کی اس کے عمل کے مطابق ہوگی۔ پھر دنیا میں تفرقہ کس لئے ہو''۔

اسی عباسی سلطنت کے ماحول کا ایک جزو بن کر جہاں صرف پیغمبر کی طرف ایک قرابت داری کی نسبت کے سبب اپنے کو خلق خدا پر حکمرانی کا حقدار بتایا جاتا تھا اور اس کے ساتھ کبھی اپنے اعمال و افعال پر نظر نہ کی جاتی تھی کہ ہم کیسے ہیں اور ہم کو کیا کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ یہ کہا جانے لگا کہ بنی عباس ظلم و ستم اور فسق و فجور میں بنی امیہ سے کم نہ رہے بلکہ بعض باتوں میں ان سے آگے بڑھ گئے اور اس کے ساتھ پھر بھی قرابت رسولؐ پر افتخار تھا۔ اس ماحول کے اندر داخل ہو کر امام رضاؑ کا اس بات پر بڑا زور دینا کہ قرابت کوئی چیز نہیں اصل انسان کا عمل ہے۔ بہ ظاہر صرف ایک شخص کا اظہار فروتنی اور انکسار نفس تھا جو بہرحال ایک اچھی صفت ہے لیکن حقیقت میں وہ اس سے بڑھ کر تقریباً ایک صدی کی عباسی سلطنت کی پیدا کی ہوئی ذہنیت کے خلاف اسلامی نظریہ کا اعلان تھا اور اس حیثیت سے بڑا اہم ہو گیا تھا کہ وہ اب اسی سلطنت کے ایک رکن کی طرف سے ہو رہا تھا۔ چنانچہ امام رضاؑ کی سیرت میں اس کے مختلف شواہد ہیں۔ ایک شخص نے حضرت کی خدمت میں عرض کی کہ ''خدا کی قسم آباؤ اجداد کے اعتبار سے کوئی شخص آپ سے افضل نہیں۔'' حضرت نے فرمایا میرے آباؤ اجداد کو جو شرف حاصل ہوا تھا وہ بھی صرف تقویٰ، پرہیزگاری اور اطاعت خدا سے۔'' ایک شخص نے کسی دن کہا کہ ''واللہ آپ بہترین خلق ہیں'' حضرت نے فرمایا ''اے شخص حلف نہ اُٹھا جس کا تقویٰ و پرہیزگاری مجھ سے زیادہ ہو وہ مجھ سے افضل ہے۔''

ابراہیم بن عباس کا بیان ہے کہ حضرت فرماتے تھے ''میرے تمام لونڈی غلام آزاد ہو جائیں اگر اس کے سوا کچھ اور ہو کہ میں اپنے کو محض رسولؐ اللہ کی قرابت کی وجہ سے اس سیاہ رنگ غلام سے بھی افضل نہیں جانتا (حضرت نے اشارہ کیا اپنے ایک غلام کی جانب) ہاں جب عمل خیر بجالاؤں تو اللہ کے نزدیک اس سے افضل ہوں گا۔''

یہ باتیں کوتاہ نظر لوگ صرف ذاتی انکسار پر محمول کر لیتے ہوں۔ مگر خود حکومت عباسیہ کا فرمانروا یقیناً اتنا کُند ذہن نہ ہوگا کہ وہ ان تازیانوں کو محسوس نہ کرے جو امام رضاؑ کے خاموش افعال اور اس طرح کے اقوال سے اس کے خاندانی نظام سلطنت پر برابر لگ رہے تھے۔ اس نے تو بخیال خود ایک وقتی سیاسی مصلحت سے اپنی سلطنت کو مستحکم بنانے کے لئے حضرت کو ولی عہد بنایا تھا مگر بہت جلد اُسے محسوس ہوا کہ اگر ان کی زندگی زیادہ عرصے تک قائم رہی تو عوام کی ذہنیت میں یک لخت انقلاب ہو جائے گا اور عباسی سلطنت کا تختہ ہمیشہ کے لئے اُلٹ جائے گا۔

## عزائے حسینؑ کی اشاعت

اب امام رضاؑ کو تبلیغ حق کے لئے نام حسینؑ کی اشاعت کے کام کو ترقی دینے کا بھی پورا موقع حاصل ہو گیا تھا، جس کی بنیاد اس کے پہلے حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ قائم کر چکے تھے۔ مگر وہ زمانہ ایسا تھا کہ امام کی خدمت میں وہی لوگ حاضر ہوتے تھے جو بحیثیت امام یا بحیثیت عالم دین

آپ کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے اور اب امام رضاؑ تو امام روحانی بھی ہیں اور ولی عہدِ سلطنت بھی۔ اس لئے آپ کے دربار میں حاضر ہونے والوں کا دائرہ وسیع ہے، مرو کا مقام ہے جو ایران کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ ہر طرف کے لوگ یہاں آتے تھے اور یہاں یہ عالم کہ ادھر محرم کا چاند نکلا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ دوسروں کو بھی ترغیب وتحریص کی جانے لگی کہ آل محمدؐ کے مصائب کو یاد کرو اور تاثرات غم کو ظاہر کرو

یہ بھی ارشاد ہونے لگا کہ ''جو اس مجلس میں بیٹھے جہاں ہماری باتیں زندہ کی جاتی ہیں۔ اس کا دل مردہ نہ ہوگا اس دن کہ جب سب کے دل مردہ ہوں گے۔''

تذکرۂ امام حسینؑ کے لئے جو مجمع ہو اس کا نام اصطلاحی طور پر ''مجلس'' اسی امام رضاؑ کی حدیث ہی سے ماخوذ ہے۔ آپ نے عملی طور پر بھی خود مجلسیں کرنا شروع کردیں۔ جن میں کبھی خود ذاکر ہوئے اور دوسرے سامعین جیسے ریّان بن شبیب کی حاضری کے موقع پر جو آپ نے مصائب امام حسینؑ بیان فرمائے اور کبھی عبداللہ بن ثابت یا دعبل خزاعی ایسے کسی شاعر کی حاضری کے موقع پر اس شاعر کو حکم ہوا کہ تم ذکرِ امام حسینؑ میں اشعار پڑھو وہ ذاکر ہوا اور حضرت سامعین میں داخل ہوئے۔

دعبل کو حضرت نے بعد مجلس ایک قیمتی حلہ بھی مرحمت فرمایا جس کے لینے میں دعبل نے یہ کہہ کر عذر کیا کہ مجھے قیمتی حلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے جسم کا اترا ہوا لباس مرحمت فرمایئے تو حضرت نے ان کی خوشی پوری کی۔ وہ حلہ انھیں دیا ہی اس کے علاوہ ایک جُبّہ اپنے پہننے کا بھی مرحمت فرمایا۔

اس سے ذاکر کا بلند طریقۂ کار کہ اسے کسی دنیاوی انعام کی خاطر یا معاذ اللہ اجرت طے کرکے ذاکری نہیں کرنا چاہئے اور بانی مجلس کا طریقۂ کار کہ وہ بغیر طے کئے ہوئے کچھ بطور پیش کش ذاکر کی خدمت میں پیش کرے۔ دونوں امر ثابت ہیں مگر ان مجالس میں سامعین کے اندر کسی حصہ کی تقسیم ہرگز کسی معتبر کتاب سے ثابت نہیں ہوتی۔

## وفات

مامون کے توقعات غلط ثابت ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ آخر امام کی جان لینے کا درپے ہوگیا اور وہی خاموش حربہ جو ان معصومینؑ کے ساتھ اس کے پہلے بہت دفعہ استعمال کیا جاچکا تھا کام میں لایا گیا۔ انگور میں جو بطور تحفہ امام کے سامنے پیش کئے گئے تھے، زہر دیا گیا اور اس کے اثر سے ۱۷ر صفر ۲۰۳ھ میں حضرت نے شہادت پائی۔ مامون نے بظاہر بہت رنج وماتم کا اظہار کیا اور بڑے شان وشکوہ کے ساتھ اپنے باپ ہارون رشید کے قریب دفن کیا۔

جہاں مشہد مقدس میں حضرت کا روضہ آج تاجداران عالم کی جبیں سائی کا مرکز بنا ہوا ہے وہیں اپنے وقت کا بزرگ ترین دنیاوی شہنشاہ ہارون رشید بھی دفن ہے۔ جس کا نام ونشان تک وہاں جانے والوں کو معلوم نہیں ہوتا۔

